سید امین اشرف

ابوسفیان اصلاحی ☆

خوب رو، خوب سیرت اور خوب صورت شاعری کا نام پروفیسر امین اشرف ہے۔ آپ کی گفتگو، آپ کی مسکراہٹ اور آپ کی باغ و بہار شخصیت آپ کی اشرفیت پر دال تھی۔ تبسم ریزی اور والہانہ پن آپ کا امتیاز تھا۔ شاعری اگر جزء الہام ہے تو شئے لطیف بھی شاعری کے لیے جز ولازم ہے۔ پروفیسر سید امین اشرف کی شاعری شئے لطیف کا مخزن تھی، اس کے بغیر اچھی شاعری اور تغزل کا ہرگز امکان نہیں۔ غزل کی زبان اور لہجے کو برتنا آسان نہیں۔ سید امین اشرف اسے بآسانی برتتے تھے کیوں کہ اس حسین وادیٔ غزل میں انھوں نے برسوں بتائے اور اپنے شعری کشکول سے لدے لدائے دنیائے شعروادب میں واپس آئے۔ شعر اور شعر گوئی کے ایسے متوالے کہ ایک بار فرمانے لگے ایک بار آرٹس فیکلٹی میں ایک شعری نشست تھی، خاکسار بھی ایک جونیر کی حیثیت سے اپنا کلام سنا رہا تھا۔ جب غزل سرا ہوا تو خلیل الرحمٰن اعظمی مرحوم نے فرمایا کہ یہ کس کی غزل ہے؟ چلئے اچھا ہوا، اتنا تو ضرور ہے کہ ناصر کاظمی آپ کو پسند آئے اچھا شاعر بننے کے لیے سخن فہمی بھی ضروری ہے۔ اسی اشتیاق وانہماک نے آپ کو ایک خوب صورت شاعر بنایا۔ جس شعری عظمت کا اعتراف اسلوب احمد انصاری، شمس الرحمٰن فاروقی اور پروفیسر مسعود الحسن نے بڑے واضح لفظوں میں کیا۔ علی گڑھ کے شعراء میں خلیل الرحمٰن اعظمی، شہریار، سید امین اشرف اور اسعد بدایونی کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ میر تقی میر کی ترجمانی کے ساتھ مذکورہ شعراء نے جدید عہد کی حسین تصویر کشی کی ہے۔

سید امین اشرف کی زندگی سے یاس وقنوطیت کا کوئی ارتباط نہ تھا۔ چوں کہ شاعر غزل تھے اس لیے بہر صورت جگمگاتے اور بہر صورت ساز غزل کو آواز دیتے۔ جب بھی گیا یونیورسٹی کی روداد لے کر بیٹھ جاتے اور اس کی علمی ترفع کے لیے فکر مند ہوتے۔ اس کے تہذیبی زوال اور ثقافتی انحطاط پر کفِ افسوس ملتے۔ یہاں کے ادبی ماحول کی ستائش بھی کرتے کہ سفیان! سرسید نے ایک

☆ ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی، شعبہ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، مدیر 'تہذیب الاخلاق' علی گڑھ، انڈیا۔

ایسا علمی شہر بسایا ہے جس کی مثال دنیا پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ابن سینا اکیڈمی کے اکثر گن گاتے کہ حکیم سید ظل الرحمٰن نے ایک ایسا شجر علم لگایا ہے جس کی تابانی سے ایک عالم منور ہے اور دن بہ دن یہ تابانی بڑھتی ہی جارہی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہی ایک ادارہ ہے جہاں اہلِ علم کو سنا جاسکتا ہے، انھیں استقبالیہ دیا جاسکتا ہے اور کتابوں کی رونمائی کی جاسکتی ہے۔ یقیناً حکیم صاحب کا یہ کام حد درجہ لائق ستائش ہے۔ اسی ابن سینا اکیڈمی میں جب آپ کے شعری مجموعہ بہار ایجاد کا اجراء ہوا تو اس سے بہت خوش تھے اور اپنے فن پر ہونے والی تقاریر پر فرحاں وشاداں۔ مجھ سے فرمانے لگے: سفیان! تم آتے تو تقاریر سے محظوظ ہوتے، تمہارے نہ آنے سے مجھے حد درجہ قلق ہے۔ خاکسار نے کہا کہ آپ کو ناراض نہیں ہونے دیا جائے گا، کوئی پاگل ہی ہے جو آپ سے اپنے رشتے کو توڑے۔ پروفیسر امین اشرف بڑے رقیق القلب انسان تھے۔ شاعر کے یہاں رقت نہ ہو تو اس کی شاعری پر سوز نہیں ہوسکتی۔ سوزش ہی شاعری کو ہوا دیتی ہے، جذبات کو بھڑکاتی اور احساسات کو دہکاتی ہے۔ ان تمام خصوصیات سے ہمارے سید صاحب لبالب تھے۔

جب خاکسار کو تہذیب الاخلاق کی ذمہ داری سونپی گئی تو بلوایا اور بلوا کر اپنی انتہائی خوشی کا اظہار کیا اور شفیق ہاتھوں سے منھ میٹھا کرایا۔ مجھے وہ گھڑی یاد آرہی ہے کہ مجھے اٹھ کر گلے لگایا، دعائیں دیں، مشورے دیے، اداریے، قرآن نمبر اوّل، قرآن نمبر دوم اور سرسید نمبر پر اتنی دعائیں دیں کہ میرے حوصلے جواں اور عزم پختہ ہوگئے۔ فرمانے لگے کہ تمہارے متعلق یہ خیر گشت کرائی گئی کہ وہ کیا چلائے گا، اس عربی والے کا اردو سے کیا رشتہ؟ میں نے عرض کیا کہ یہی کچھ سید محمد افضل سابق رجسٹرار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ نے بھی کہی کہ بھائی! تمہارے متعلق لوگوں نے مجھے یہی بتایا کہ اسے اردو نہیں آتی، وہ رسالے کو ڈبوئے گا، اس کا معیار گرائے گا۔ محترم سید محمد افضل نے فرمایا کہ تمہارے اداریوں اور شہریار پر تمہارے مضمون سے واضح ہے کہ تمہارے اوپر یہ سب نرا الزام اور سراسر بہتان ہے۔ میں نے جواباً عرض کیا کہ مجھے ان الزامات کی پرواہ نہیں، اس کا جواب قارئین دیں گے۔ اس طرح کے مسائل میں الجھنے سے ذہن بٹتا ہے، کام پر اثر پڑتا ہے۔ مجھے شرح صدر کے ساتھ کام کرنا ہے اور اپنے اللہ سے مدد مانگنی ہے اور اپنے مولانا مودودیؒ کے اصول کو دانتوں تلے دبانا ہے۔ پروفیسر سید امین اشرف صاحب کا تہذیب الاخلاق سے غیر معمولی تعلق تھا۔ جب ''مشاہیر علی گڑھ'' کے نکالنے کا اعلان کیا گیا تو ڈاکٹر شبیر کے ذریعہ رقعہ بھیجا اور اس پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے پیشگی مبارک باد دی کہ یہ ایک اہم کام ہے، اس کی وجہ سے ادارۂ سرسید کی علمی اور ثقافتی تاریخ قلم بند ہوجائے گی۔ جب خاکسار نے مقالے کے لیے دعوت نامہ خدمت اقدس میں ارسال کیا تو انھوں نے فہرست مشاہیر کو غور سے پڑھا اور بہت سے ناموں کا اس میں اضافہ کیا اور اس تعلق سے خاکسار کو دو مرتبہ خط تحریر کیا اور اس میں بہت سے مشاہیر کا اضافہ کیا۔ وہ شدت سے مشاہیر کی پہلی جلد کا انتظار کررہے تھے لیکن افسوس صد افسوس کہ مشاہیر علی گڑھ کے آنے سے چند روز قبل یہ مشاہیر علی گڑھ کا عاشق ہم لوگوں سے بہت دور چلا گیا جہاں سے واپسی نہیں ہوتی۔ اسی طرح مشاہیر علی گڑھ کے دوسرے عاشق پروفیسر کبیر احمد جائسی، جن کے بے شمار مشورے اس کی ترتیب و تہذیب میں شامل ہیں، اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے تھے، سینے سے لگانا چاہتے تھے اور روح کی غذا بنانا چاہتے تھے۔ حیف در حیف کہ یہ عاشقِ مشاہیر بھی گنجہائے گراں مایہ میں جا شامل ہوا۔ دل چاہتا ہے کہ اسے یہ اس کا گل دستۂ آرزو پیش کروں۔ مشاہیر

کے تعلق سے دوبارہ پروفیسر جائسی سے ملاقاتیں ہوئیں، مضامین کی حصول یابی پر گفتگو ہوئی اور بار بار کہتے کہ سفیان میرے تین مقالات رفیق صدیق (ابن فرید) وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں (پروفیسر اسرار احمد)، اپنے طرب آگہیں کا شکار (انور صدیقی) تینوں جلدوں میں ضرور شامل کرنا۔ میں نے عرض کیا کہ مشاہیر کی چوتھی جلد زندہ مشاہیر پر مشتمل ہوگی تو اس میں آپ کے اوپر کس کا مضمون شامل ہوگا، تو انھوں نے ایک مضمون کی نشان دہی کی لیکن اسے شامل کرنے سے قاصر ہوں کیوں کہ اس میں خاصی کتر بیونت کرنی ہوگی۔ ان شاء اللہ خاکسار اپنا مضمون جائسی صاحب مرحوم پر شامل کرے گا۔

اسی طرح احقر نے جب سید امین اشرف سے دریافت کیا کہ آپ سے متعلق کس کا مقالہ لیا جائے تو انھوں نے فرمایا کہ یہ مضمون زیادہ مناسب رہے گا۔ وہ اس بات سے خاصا خوش تھے کہ آپ کو مشاہیر علی گڑھ میں شامل کیا جارہا ہے۔ بہت سے ہمارے اساتذۂ کرام ایسے ہیں جو زندہ مشاہیر پر جلد ترتیب دیے جانے پر برافروختہ ہیں۔ ایک صاحب نے فرمایا کہ مخالفت اور برافروختگی کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان کے نام ان مشاہیر میں شامل نہیں ہیں۔ مشاہیر میں شامل ہونے کے لیے راتیں خون کرنی پڑتی ہیں، آرام و آسائش کو تجنا پڑتا ہے اور محفل رنگیں سے رشتہ و ناطہ توڑنا پڑتا ہے۔ انہی تمام وجوہ کی بنیاد پر دنیا اسلوب احمد انصاری، اقتدار احمد صدیقی اور محمد شمیم جے راج پوری کو جانتی ہے۔ کیا ایسے قد آور اور جلیل القدر اصحاب فضل کو مشاہیر میں نہ شامل کیا جائے۔ ہمارے سید امین اشرف صاحب بھی ہمارے مشاہیر کا گراں قدر حصہ ہیں۔ ادارۂ سرسید کے شعراء میں ان کا قد نکلا ہوا اور رنگ نکھرا ہوا ہے۔ آپ کی انفرادیت اور آپ کی امتیازی خصوصیت آپ کو کہاں مرنے دے گی؟ مرتا تو وہ ہے جس نے وقت کو نہ پہچانا ہو اور جس نے قلم و قرطاس سے عداوت مول لے رکھی ہو۔ ہمارے امین اشرف صاحب کی غزلیں اور ان کے لب و لہجے انھیں ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔ ان کی انسانیت اور بھلمنساہت انھیں کب مرنے دے گی۔

علی گڑھ کی نمائش کا ادارۂ سرسید سے گہرا تعلق رہا ہے۔ نمائش روایاتِ علی گڑھ کا ایک جیتا جاگتا حصہ رہی ہے۔ مجاز نے اس کا تذکرہ کر کے اس میں مزید رنگ بھر دیا ہے۔ سرسید کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اپنے ادارے کی مالی امداد کے لیے اس میں رقص تک کر ڈالا اور اس طرح اس میں بک اسٹال بھی لگایا تا کہ ادارے کو مالی منفعت پہنچ سکے۔ محمد ذاکر علی خاں مرحوم کی علیگیت سے کون واقف نہیں؟ جب آج سے دس سال قبل ہندوستان آئے تو اسّی سالہ ہونے کے باوجود نمائش کا چکر کاٹنے سے باز نہ آئے اور خوب لپک لپک کر اس کا تذکرہ کیا۔ عبداللہ کالج سے اس کے رشتوں کو بڑے رنگین مزاجی سے قلم بند کیا۔ علی گڑھ کے لٹریچر میں نمائش کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ گو کہ نمائش کی روایات بلکہ شباب باقی نہ رہا لیکن اس کے پیراہن رنگیں کی یاد ہمارے پروفیسر سید امین اشرف کو اب بھی ستاتی تھی۔ اسی اضطراب نے انھیں نمائش کے ہنگاموں میں گھل جانے اور وہاں کے خوش بودار کھانوں سے کام و دہن کو سرفراز کرنے کے لیے مجبور کیا۔ چنانچہ اپنے عزیز بلکہ عزیزوں سے عزیز تر فکر و نظر کے (سابق) نائب مدیر جناب محمد صابر کو آواز دے ڈالی کہ نمائش کے قہقہوں سے دل بہلانے کی خواہش ہے، صابر صاحب نے بارہا کہا کہ یہ عمر دل بہلانے اور دل دینے کی نہیں ہے لیکن وہ بچوں کی طرح چھیلا گئے، بلکہ زبان حال سے یہ کہہ رہے تھے کہ عمر کا دل سے کیا تعلق؟ دل ہمیشہ جوان رہتا ہے، اس لیے اپنی تمام تر پیری کے باوجود غالب نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہہ ڈالا:

رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے
گو ہاتھ میں جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے

بہر کیف صابر صاحب نے اپنے بیٹے کو حکم دیا کہ گاڑی نکالو۔ کیوں نہ نکالتے۔ پروفیسر سید امین اشرف چچا کے کلاس فیلو تھے، انہی کی محبت میں صابر صاحب کو بھی اکثر عزت بخشتے تھے۔ پروفیسر صاحب سے صابر صاحب اور ان کے افراد خانہ کے گھریلو مراسم تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے مکنوناتِ قلب سے واقف تھے۔ اس رشتے کی عمر تیس سالوں پر محیط تھی اور یہ احاطۂ مدت ہر طرح کے تکلفات اور بعض عناد سے پاک صاف کوثر و تسنیم سے بھی زیادہ آب دار، بڑی محبت و عقیدت سے پروفیسر سید امین اشرف کو نمائش کی طرف لے کر چلے لیکن کیا معلوم تھا کہ چند لمحوں بعد موت اپنا کھیل کھیلنے کے لیے تیار ہے، ایک خوب صورت، رنگین مزاج، تصوف شناس، بھلے انسان اور شفیق شخص کو اپنے آغوش میں لینے کے لیے آمادہ ہے۔ چنانچہ کار سے اتر کر چند قدم چلنا ان کے لیے ممکن نہ ہوسکا، بیٹھ گئے اور بیٹھتے ہی ان کا دل بھی بیٹھ گیا۔ صابر صاحب کی آغوش میں انھوں نے آنکھیں بند کیں اور پھر اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کردی۔ اس سپردگی کا عجیب انداز تھا، ایسا دل دوز اور ایسا جاں گسل کہ صابر صاحب کی آنکھیں اشک بار ہوگئیں۔ ان کا کہنا ہے کہ زندگی میں اب تک ایسے دو لمحے آئے، ایک تو بھائی کی موت نے میرے عقل و ذہن کو متاثر کیا اور دوسرے اس حادثے نے تو مجھے کسی قابل ہی نہ چھوڑا۔ اسی نمائش، اسی سراب بلکہ خراب کی تصویر کشی قرآن کریم نے اس طرح کی ہے:

''کلّا بل تحبون العاجلة و تذرون الآخرة'' (القیامۃ: ۷۵/۲۰۔۲۱) نہیں نہیں، تم جلدی ملنے والی (دنیا) کی محبت رکھتے ہو اور آخرت سے غافل ہو۔

صدر شعبۂ اردو پروفیسر محمد زاہد صاحب کا بھی سید امین اشرف سے غیر معمولی تعلق تھا۔ دونوں بھائیوں کے ساتھ ان کا چچا جیسا رشتہ رہا اور دونوں بھائی انھیں اپنے چچاؤں سے کم نہ گردانتے تھے۔ زاہد صاحب کو بھی پروفیسر اشرف کی موت سے شدید غم ہے، چنانچہ اظہارِ غم اور نوحہ خوانی کے لیے تعزیتی نشست کا اہتمام کیا جس میں مختلف اہلِ علم نے ان کے امتیازات اور ان کی شعری خصوصیات کا ذکر کیا۔ پروفیسر محمد زاہد نے اپنے دلی کیفیات کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

''مرحوم سید امین اشرف شعبۂ انگریزی کے استاد کے ساتھ ہی ایک اچھے شاعر اور ایک اچھے انسان بھی تھے۔ ان کے مزاج میں ایک صوفیانہ درویشی، قلندری اور کشادہ قلبی پائی جاتی تھی۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''جادۂ شب'' کے نام سے ۲۰۰۰ء میں، دوسرا شعری مجموعہ ''بہار ایجاد'' ۲۰۱۲ء میں، تیسرا مجموعہ ''قفسِ رنگ'' کے نام سے شائع ہوا۔ شعری خدمات کے لیے انھیں غالب ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ ان کے سانحۂ ارتحال سے اردو ادب کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی ناممکن ہے۔'' پروفیسر محمد زاہد نے (مزید) کہا کہ: ان کی کلاسیکی شاعری اردو ادب کا سرمایہ ہے جس پر آئندہ سیشن میں تحقیقی کام شروع کیا جائے گا۔''

پروفیسر محمد زاہد نے آپ کی بڑی سچی تصویر کشی کی ہے، استغنا آپ کی شخصیت کا جزلاینفک ہے۔ پچھلے دنوں خاکسار نے شہریار پر ایک مضمون تحریر کیا جس میں غلطی سے کچھ اشعار آپ کے نقل ہوگئے، اس کی وجہ سے انھوں نے میری زبانی اور تحریری تنبیہ

کی۔ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوکر معذرت پیش کی جسے انھوں نے شرح صدر کے ساتھ قبول کیا۔ پروفیسر سید امین اشرف کی خردنوازی بھی قابلِ ذکر ہے۔ جب بھی گیا نہایت وسیع القلبی سے سراہتے، اکثر کانفرنس گزٹ اور تہذیب الاخلاق میں میرے شائع شدہ مضامین کا ذکر کرتے (ورنہ) ادارۂ سرسید کے اساتذۂ کرام اس باب میں حد درجہ بخیل واقع ہوئے ہیں۔

پروفیسر امین اشرف صاحب سوٹ اور شیروانی دونوں میں خوب جچتے تھے۔ گرمیوں میں آپ کا ایک منظر دیکھ کر لاہور کے علامہ اقبال یاد آئے۔ بنیائن اور لنگی میں اپنے تخت پر براجمان ہوتے تو ایسا لگتا کہ نظریہ تناسخ کے قائلین ٹھیک ہی ہیں، اگر ایسا نہ ہوتا تو ہمارے پروفیسر علامہ اقبال کی یہ صورت کیسے دھار لیتے؟ لیکن اتنا تو ہے کہ وہ ہمیشہ ''اقبال'' ہی تلفظ فرماتے تھے، نہ کہ ''اکبال''۔ جب کہ ہمارے شاعرِ مشرق (بلکہ شاعرِ عالم) تادمِ زیست ''اکبال'' ہی کہتے رہے۔ رشید احمد صدیقی نے بھی اس شاعر سے ''اکبال'' ہی سنا۔ بہتر ہوتا کہ اُمت مسلمہ انھیں شاعرِ مشرق اور شاعرِ اسلام نہ کہہ کر شاعرِ عالم کے خطاب سے یاد کرتی کیوں کہ دنیا کے بڑے شعراء میں علامہ اقبال کو شمار کرنا ناگزیر ہے۔ یہی خیال پروفیسر اشرف نے یوں تحریر کیا کہ ''اقبال کی شاعری اپنے معنی و مفہوم کے لحاظ سے کثیر الابعاد Multidimensional ہے۔'' راقم الحروف کی کیا مجال کہ اقبال کی کسی نظم پر اظہار خیال کرے۔'' چلیے ہم تو اس عظیم شاعر کے لیے ثنا خواں ہیں کہ انھوں نے ہمارے سرسید کو دل کی گہرائیوں سے خراجِ عقیدت پیش کیا اور ہمارے عبدالعزیز میمن کے تقرر میں نمایاں رول ادا کیا۔

پروفیسر سید امین اشرف کی شاعری، لب و لہجے اور تغزل کی تاثیر کی قدردانی پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے کی ہے۔ اس لیے اس میں کسے کلام ہوسکتا ہے؟ آپ کی شاعری کو موضوعِ بحث بنانے سے قبل مناسب ہوگا کہ ان کے مجموعۂ مضامین ''برگ و بار'' پر کچھ کہنے کی جسارت کی جائے۔ اس میں دس تنقیدی مضامین، تین تراجم، آٹھ نظموں کے تجزیے اور چھ تبصرے شامل ہیں۔ اس کتاب سے پروفیسر صاحب کے کئی پہلو منظرِ عام پر آتے ہیں۔ ایک تو فارسی زبان سے بھی واقف تھے، انگریزی ادب کا ایک بڑا سرمایہ ان کے زیرِ مطالعہ رہا ہے، تنقیدی واجبات سے بھی واقف تھے اور تصوف ان کے جسم و جان میں بسا ہوا تھا۔ جیسا کہ اپنے متعلق انھوں نے خود فرمایا کہ: ''حضرت مخدوم سید اشرف جہاں گیر سمنانیؒ کی اولاد اور خانوادۂ اشرفیہ کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے تو یہ خاکسار راقم الحروف تصوف کے نظری اور عملی پہلوؤں سے ہمیشہ وابستہ رہا۔'' ہماری تصوف کے شیدائیوں سے التماس ہے کہ اس کے لیے قرآن کریم کو میزان و معیار بنائیں، وہی ایسا قسطاس مستقیم ہے جو تصوف اور صوفیۂ کرام کی حقیقی پردہ کشائی کرسکتا ہے۔ بہرکیف یہ کتاب آپ کی تنقیدی بصیرت پر دال ہے۔ پروفیسر اشرف کی فارسی اور انگریزی ادب پر اچھی نظر تھی، اس لیے وہ تنقید کے معنی و مفہوم کو سمجھتے تھے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ علی گڑھ کے بعض ناقدین یوں ہی خالی خولی ہوا میں تیر چلاتے ہیں اور انگریزی ناقدین کے نام گنواتے ہیں لیکن پروفیسر سید امین اشرف براہِ راست انگریزی سوتوں سے واقف تھے۔ آپ نے یہ مجموعہ دیتے ہوئے تحریر فرمایا تھا: ''محبت کے ساتھ-علم دوست اور علی گڑھ تہذیب کے نمائندہ برادرم ابوسفیان اصلاحی کے لیے۔ از نیامند۔ امین اشرف، ۱۳/اکتوبر ۱۲ء۔''

پروفیسر سید امین اشرف کی شاعری اور اس کی خصوصیات کا تجزیہ پروفیسر اسلوب احمد انصاری اور شمس الرحمٰن فاروقی نے بڑی دیدہ ریزی سے کیا ہے۔ ان دونوں تحریروں سے آپ کی شاعرانہ پرتیں کھلتی ہوئی نظر آجاتی ہیں۔ آپ کا تغزل قاری کو ایک خاص حقیقت سے دوچار کرتا ہے۔ یہ کیفیت ایسی رنگین اور موثر ہے کہ اس کی تاثیر سے نکلنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ تغزل کے تقدس کی پاس داری کا آپ نے حد درجہ خیال رکھا ہے۔ آپ کی دنیائے غزل ایسی پاکیزہ اور ایسی پُرکشش کہ پارسائی معرضِ خطر میں آجائے۔ غزلیں پڑھتے تو اندازہ ہوتا ہے کہ آپ لفظوں کے سبک پن سے پوری طرح باخبر ہیں، آپ کی فن کاری کا کاریگران فن سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہاں چند اشعار حظِ طبع کے لیے نقل کیے جا رہے ہیں:

آخر شب ہے مگر نیند کہاں چاند کو آج — جیسے وہ رُخ روشن کا تمنائی ہے
گرمیِ شوق فقط میری نظر سے ہی نہیں — آنچ آتی ہے دمکتے ہوئے رخساروں سے
تیری آہستہ خرامی ہے کہ فیضانِ بہار — گل و گلزار ہوئے جاتے ہیں ویرانے تک

مذکورہ اشعار کو پڑھ کر خلیل الرحمٰن کے مندرجہ ذیل الفاظ یاد آتے ہیں:

''کسی تجزیہ کار نے سچے غزل گو کی پہچان یہ بتائی ہے کہ اس کی شخصیت اور مزاج میں ہوش اور گم شدگی کا ایک سنگم ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے امین اشرف نہ صرف یہ کہ ایک کھرے اور خالص غزل گو ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا کہ وہ غزل کہتے نہیں بلکہ غزل ''بسر'' کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ پیشین گوئی قبل از وقت ہے مگر اس کا یقین ہے کہ اگر امین اشرف کے شعری مزاج، بالخصوص ان کے مستانہ لہجے کو پروان چڑھنے کا موقع ملا تو ان کے ہاتھوں اردو غزل میں اس نوع کے امکانات پیدا ہو سکتے ہیں جو حافظ شیرازی کی غزلیہ شاعری کا خاصہ ہے۔''

ہے کوئی راہ رو دشت و جبل — گنگناتا ہے لب جو کوئی
خانہ زنجیر کیا ہے اس نے — بند آنکھوں میں ہے آہو کوئی
لذت دید خدا جانے کہاں لے جائے — آنکھ ہوتی ہے تو ہوتا نہیں قابو دل پر
دل اس کا ہتھیلی پہ ہے میرے لیے لیکن — ہاتھوں میں میرے دست حنائی نہیں دیتا
آرائشِ جاں کے لیے کافی نہیں وحشت — مجھ کو تو کوئی زخم دکھائی نہیں دیتا
نہیں ہے قامتِ بالا سے کم مرا قد بھی — وہ آسماں ہے تو ہو، میں بھی خود پسند ہوا
خمارِ عشق ہے، جاتا نہیں میاں ناصح — قتیلِ روئے صنم، طالبِ دعا ہوں میں

مذکورہ اشعار سے امین اشرف کی غزلیہ ترفع کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انھیں اچھے شعراء میں شمار نہ کرنا مکمل ناانصافی ہوگی۔

ایک چیز جو قابلِ اعتراض ہے، وہ ہے اپنی کتابوں پر تقاریظ لکھوانا یا ناقدین اور اہلِ قلم کی آراء سے اسے انھیں مزیّن کرنا کیوں کہ انسان کی تخلیق وتحریر میں اگر کوئی دم، کوئی فکر وخیال ہے تو اسے دنیا نہ چاہتے ہوئے بھی نظر انداز نہیں کر سکتی۔ طلوعِ آفتاب کسی کی شہادت کا ہرگز محتاج نہیں۔ ''قفسِ رنگ'' میں جس طرح اصحابِ قلم کی آراء نقل کی گئی ہیں وہ کم از کم احقر کے لیے باعثِ رنج ہے۔ خاکساران

آراء سے احتراز واجتناب جزوِ ایمان سمجھتا ہے۔ ویسے بھی تعریف کرنے والوں کے منہ مٹی جھونکنا فرمانِ رسولؐ ہے۔ تقریظ تو دور کی بات ہے، اس علی گڑھ میں اپنے اوپر کتابیں لکھوانے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی جاتی۔ طلبہ کو موضوعِ تحقیق بنانے پر مجبور کرتے ہیں۔ رہے ہمارے محمد ذاکر علی خاں تو اتنا عظیم شخص کہ کبھی اس نے ''ذاکر علی گڑھ'' کی ترتیب کے لیے اشارہ بھی نہیں کیا۔ بہرکیف سید امین اشرف علی گڑھ کے ایک سنگ میل تھے۔ ۷رفروری ۲۰۱۳ء کو یہ جاذبِ نظر سنگ میل دفعتاً نظروں سے اوجھل ہوا اور ۸رفروری کو یہ زیرِ زمیں آسودۂ خاک ہے جس کے جانے سے ادارۂ سرسید تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ اب تو ''بزمِ صوفیہ'' بھی ان کے بغیر خاموش ہے۔ آج سید صاحب کی سرمستی، لطیف ولذیذ آوازیں اور شعری محاسن یاد آتے ہیں۔ جایئے تو ایسا استقبال واظہار کہ آپ کی صحبت سے اُٹھنے کو جی ہی نہ چاہے۔ بہت دنوں تک یہ آنکھیں ان کے لیے اشک بار رہیں گی۔ اس مصرعہ کے ساتھ اجازت چاہوں گا۔

کہا جو کچھ تو ترا حسن ہوگیا محدود

حالیہ مطبوعاتِ قرطاس

☆ **وفیاتِ معارف**

ارباب علم وفضل کے انتقال پر ماہنامہ معارف اعظم گڑھ میں شائع ہونے والی تحریروں
(جولائی ۱۹۱۶ء تا دسمبر ۲۰۱۲ء) کا انسائیکلوپیڈیا

مرتبہ

ڈاکٹر محمد سہیل شفیق

صفحات: ۷۹۴ (بڑا سائز) قیمت: ۱۵۰۰ روپے ISBN: 978-969-9640-02-5

☆ **مطالعہ سیرت عہد بہ عہد**

جسٹس ڈاکٹر محمود احمد غازی (م ۲۵ ستمبر ۲۰۱۰ء) کے مشہور سلسلۂ محاضرات
میں سے محاضراتِ سیرت کی تلخیص

از

محمد رضا تیمور

صفحات: ۱۷۵ قیمت: ۲۵۰ روپے ISBN: 978-969-9640-03-2

☆ **مولانا عبدالسلام ندوی: ایک مطالعہ**

مولانا عبدالسلام ندوی کے فکر وفن اور علمی خدمات پر پاکستان میں شائع
ہونے والے پہلی کتاب ان کے شاگرد رشید کے قلم سے

از

ڈاکٹر کبیر احمد جائسی (م ۷ جنوری ۲۰۱۳ء)

صفحات: ۱۹۶ قیمت: ۲۴۰ روپے ISBN: 978-969-8448-96-7